سے سمجھ سکتا ہے اور نہ ان کی صحیح عقلی اور علمی ترتیب کو دریافت کر سکتا ہے۔ زندگی کو درست اور پُرامن اور خوشگوار بنانا اور حقائق عالم کی عقلی ترتیب کا دریافت کرنا انسان کی یہ دونوں ضرورتیں ایسی ہیں کہ نبوّت کی روشنی کے بغیر ان کی تکمیل ممکن نہیں لیکن انسان کی پہلی ضرورت فوری تکمیل کا تقاضا کرتی ہے اور دوسری ضرورت اس نوعیت کی ہے کہ اگرچہ اس کی تکمیل کے لیے انسان ہر روز ایک قدم آگے اٹھاتا ہے لیکن اس کی آخری اور پوری تکمیل نوعِ بشر کے علمی ارتقا کے ایک خاص مقام پر ہی ہو سکتی ہے اس سے پہلے نہیں ہو سکتی یہی سبب ہے کہ نبوّت اپنے کمال کو پہنچ کر بھی نظامِ عالم کی عقلی ترتیب کی واقفیت بہم پہنچانے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ صرف اس اعلیٰ قسم کے وجدان کی تربیت کا اہتمام کرتی ہے جو آخر کار اس واقفیت کے حصول کے لیے ضروری ہے اور جس کے بغیر ہمارا عقلی استدلال کامل طور پر درست نہیں ہو سکتا۔ فلسفہ نے ٹھیک سمجھا کہ نظامِ عالم ایک زنجیر کی طرح ہے جس کی ہر کڑی اگلی کڑی کے ساتھ ایک عقلی اور علمی تعلق رکھتی ہے لہٰذا اسے یہی نظر آیا کہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ سلسلۂ عالم کی ساری کڑیوں کو عقل کی مدد سے دریافت کر لے گا لیکن بدقسمتی سے وہ ہر بار اپنے غلط وجدان کو ہی ایک منطقی زنجیر کی شکل دیتا رہا اور لہٰذا ہمیشہ ناکام رہا۔ اگر فلسفہ ذرا جرأت سے قدم اٹھاتا اور نبوّت کاملہ کے تصورِ حقیقت کو جب کہ وہ دنیا کے اندر ظہور پذیر ہو کر اس کی تعلیم دے چکی تھی، اپنا لیتا تو اس کی پریشانیاں ختم ہو جاتیں اور وہ صحیح عقلی استدلال جو صدیوں سے اس کی جستجو کا مرکز رہا تھا اسے حاصل ہو جاتا لیکن جب تک فلسفہ اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ چلتے چلتے نبوّت کے تصورِ حقیقت کے قرب و جوار میں ایک خاص مقام پر نہ پہنچ جاتا یہ دلیرانہ قدم اٹھانا اس کے لیے ممکن نہ تھا خوش قسمتی سے اس بیسویں صدی میں طبیعات، حیاتیات اور نفسیات کے انکشافات کی وجہ سے فلسفہ کو یہ مقام حاصل ہو گیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس نے اقبال کی حکمت میں تعلیم نبوّت کی اصل یعنی توحید یا حقیقتِ کائنات کے صحیح تصور کے ساتھ پیوست ہونے کا دلیرانہ قدم بھی اٹھا لیا ہے۔ اقبال کا فلسفہ خود ہی نبوّت کے عطا کیے ہوئے تصورِ حقیقت کی ایسی تشریح بہم پہنچاتا ہے جس میں آج تک کے دریافت کیے ہوئے تمام علمی حقائق سموئے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس بات کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مستقبل کے علمی حقائق بھی اس کے اندر کیوں سموئے نہ جا سکیں گے۔ فلسفہ کے اس دلیرانہ قدم نے اب راہِ گم کردہ

عقل کو اپنی منزل مقصود پر پہنچا دیا ہے اور اب اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا کہ وہ اس کے بعد بھی بھٹکتی رہے گی۔ اگرچہ اسے عالمگیر انسانی سطح پر سمجھنے کے لیے کچھ وقت لگے گا کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکی ہے اور اس کے آگے اب اس کی کوئی منزل نہیں:

در جہان کیف و کم گردید عقل
پے بہ منزل برد از توحید عقل
ورنہ ایں بے چارہ را منزل کجاست
کشتئ ادراک را ساحل کجاست

(جاری ہے)

بقیہ: خدمتِ قرآن کے میدان

تاہم اس میدان میں اردو زبان میں ابھی بہت کم کام ہوا ہے — اور مزید توجہ طلب ہے۔

خدمتِ قرآن کے ان میدانوں میں مستحکم بنیادوں پر قرآن کے لئے خدمات سرانجام دینے کے لئے ہر کوشش مسلمان کے لئے ایک بڑی سعادت ہے

تشریعِ قرآنی کے نفاذ سے بظاہر قرآن کے لئے مختلف خدمات سرانجام دینے میں بھی مزید استحکام کی توقع کی جا سکتی ہے۔

لیکن چاہے جو میدان ہو یا جو مرحلہ، قرآن کی خدمت کرتے ہوئے یا خدمت کی توفیق پاتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اور اس سے خلوصِ نیّت حاصل ہونے کی دعا کرنی چاہیئے۔ یوں تو نیکی کے کسی میدان میں بھی ایسا ہونا ممکن ہے۔ تاہم قرآن کے لئے اور قرآن کے نام سے کوئی کام کرتے ہوئے ضرور کسی نہ کسی مرحلے پر شیطان سے واسطہ پڑنے کے امکانات زیادہ ہیں چاہے وہ اپنا نفس ہو یا کوئی خارجی قوت۔

اور شاید اسی لئے قرآن پڑھنے سے پہلے ہی شیطان سے اس متوقع تصادم سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ کی پناہ طلب کرنے کا حکم ہے۔

عبدالکریم عابد

پرویز صاحب کے افکار کا شجرۂ نسب

(آخری قسط)

عام طور سے جو اعتراض منکرین حدیث کی طرف سے کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ حدیث عہد رسالت کے بعد مرتب ہوئی۔ منکرین حدیث کے بیانات کی یہ خصوصیت تضاد ہے، وہ ایک طرف جہاں یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے عہد میں علم حدیث کا وجود نہیں تھا۔ وہاں یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حدیث کے جمع شدہ ذخیرے جلا دیئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر حضور اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں حدیثیں لکھی ہوئی نہیں تھیں تو پھر حضرت عمرؓ نے آخر کیا چیز جلائی تھی؟ خود منکرین حدیث ہی کے بیان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کم از کم دور نبویؐ اور عہد ابوبکرؓ میں حدیثیں تحریری طور پر موجود تھیں۔ کیونکہ اگر یہ موجود نہ ہوتیں تو حضرت عمرؓ پھر اسے جلا کس طرح سکتے تھے؟ اگر منکرین حدیث یہ تسلیم کرلیں کہ عہد فاروقیؓ تک احادیث و روایات کا تحریری سلسلہ موجود تھا تو بڑی مشکل آسان ہو جائے گی، ان کے مزید اطمینان کے لئے چند اور روایتیں اس بارے میں دیتے ہیں:۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ میں مجھ سے زیادہ کسی کے پاس حدیثیں محفوظ نہیں تھیں۔ البتہ عبداللہ بن عمرو مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ وہ آنحضرت کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔ (صحیح بخاری باب العلم)

حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت صلعم سے جو سنتے لکھ لیا کرتے تھے۔ قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت صلعم کبھی غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوشی میں اور تم سب لکھ لیتے ہو۔ عبداللہ بن عمرؓ نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرتؐ سے یہ واقعہ بیان

کیا۔ آپؐ نے دہانِ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو۔ اس سے جو قول نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔ (ابو داؤد جلد ۲ ص [illegible])

ان ۲ دو روایتوں کے علاوہ اور بھی کئی روایتیں اس مضمون کی مل سکتی ہیں۔ ایک صحابی جو آنحضرتؐ کی حدیثیں قلم بند کیا کرتے تھے، اُن کے مجموعۂ احادیث کا نام "رویائے صادقہ" تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت انسؓ کے پاس بھی حدیثوں کا لکھا ہوا ہونا ثابت ہے۔

احادیث کی روایتوں کے سلسلہ میں جو احتیاط کی گئی تھی اس کا حال پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ رسولؐ اکرمؐ کے اصل حالات و واقعات اور اقوال و افعال کے محفوظ رہنے میں کوئی شبہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت عمرؓ کا طریقہ تھا کہ جب کوئی صحابی روایت حدیث کرتے تو اُن سے وہ چند گواہ بطور ثبوت طلب کرتے۔ اگر یہ معتبر گواہ مل جاتے تو حدیث صحیح تسلیم کر لی جاتی اور ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی۔ اور اگر معتبر گواہ نہ ملتے تو حدیث کو صحیح نہ سمجھا جاتا اور روایت بیان کرنے والے کو دُرّے کی سزا دی جاتی۔ اپنے اس طریقے میں حضرت عمرؓ اس قدر سخت تھے کہ انہوں نے بعض صحابۂ کبار کو بھی سزائیں دی ہیں۔ اگر حضرت عمرؓ حدیث کے مخالف ہوتے تو اس کے بیان کرنے والے کو فوراً ہی سزا دی جاتی۔ اس سے گواہی کا مطالبہ کیوں کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ یہ چاہتے تھے کہ حدیثیں معتبر شہادتوں کی موجودگی ہیں اختیار کی جائیں۔ اسی لئے ان کے زمانے میں عام لوگوں کے لئے روایت حدیث کی اجازت نہ تھی۔

محدثین نے جو روایتیں بیان کی ہیں، اس روایت کی ہر کڑی یعنی راوی پر باقاعدہ ریسرچ کیا ہے اور اس راوی کا نام، پیشہ، عمر، سلسلۂ نسب، خاندانی حالات، ذاتی مشاغل، تعلیمی قابلیت، قوت حافظہ، صحت جسمانی، عادات و اطوار، سابقہ اور موجودہ مذہبی عقائد، غرض ہر جزئی سے جزئی تفصیل معلوم کرنے کے بعد اُسے مندرج کر دیا۔ تاکہ بعد میں آنے والے بھی ہر ہر راوی کے بارے میں اعتماد کر لیں۔ چنانچہ اس عظیم ریسرچ کے نتیجہ میں اسماء الرجال کی کتابیں تیار ہوئیں۔ ان کتابوں میں کئی لاکھ آدمیوں سے متعلق تفصیل مع محدثین کی آراء کے لکھی ہوئی ہیں۔ اور اب آپ کو جب کبھی کسی حدیث کے بارے میں شبہ ہو تو اس کے راویوں کی جانچ پڑتال کے لئے پہلے حدیث کی سند دیکھیے۔ اس سند میں جو نام پائے جاتے ہوں ان سے

متعلق محدثین کی ریسرچ اسماء الرجال کی کتابوں میں پڑھ ڈالیے اور پھر فیصلہ کر لیجئے کہ حدیث کا رواۃ و اسناد کے اعتبار سے کیا درجہ ہے؟

ان محدثین کی دیانت کا یہ حال تھا کہ اگر ان کو کوئی حدیث اپنی دانست میں ذرا سی کمزور یا ضعیف بھی نظر آئی تو انہوں نے اسے لکھ دیا اور تصریح کر دی کہ ہماری اس حدیث کے بارے میں یہ رائے مندرجہ وجوہات کی بنا پر ہے۔ کوئی اور چاہے تو مزید ریسرچ کرے شاید صحیح ثابت ہو۔ اور امت کے علم میں ایک مزید قول یا فعل رسولؐ کا اضافہ ہو جائے۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تھے تو محض اپنے اختیار تمیزی کی بنا پر اسے رد کر سکتے تھے۔ کوئی ان کو پوچھنے والا نہ تھا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں مگر اپنی ذمہ داری کا خیال محدثین کو بے چین کئے ہوئے تھا۔ اور اسی ذمہ داری کے احساس نے ان کے قلوب کی یہ کیفیت کر دی تھی کہ جب کوئی راوی یا محدث حضورؐ کی روایت بیان کرتا یا لکھتا تو بسا اوقات فرطِ خشیت الٰہی سے لرزنے لگتا اور روایت بیان کرنے یا لکھنے سے پہلے بارگاہِ الٰہی میں انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ گڑگڑاتا، نماز پڑھتا اور دعا کرتا کہ یا اللہ تو میری زبان اور قلم سے کوئی ایسی حدیث نکلنے نہ دے جو غیر صحیح ہو۔ ورنہ روز آخرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں کیا منہ دکھاؤں گا اور جب حضورؐ پوچھیں گے کہ تم نے میرے بارے میں ایک غلط بات کیوں بیان کی یا لکھی تو میں کیا جواب دوں گا؟

اس خوف نے ان کو اتنا محتاط بنا دیا تھا کہ ایک محدث نے کسی بہت ہی ثقہ راوی کو دیکھا کہ وہ راستہ میں کچھ کھاتے جا رہے تھے، تو انہوں نے ان کی روایت ناقابلِ اعتبار قرار دی کہ ایسے شخص کا کیا بھروسہ جو اتنا لاابالی ہو کہ معمولی آداب مجلس کی بھی پروا نہ کرے۔ ایک اور محدث کا واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک شخص سے روایت لینے کے لئے دور دراز کا سفر طے کیا اور جب اس کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ کسی برتن میں کچھ دانہ رکھ کر گھوڑے کو دکھا رہے ہیں، گھوڑا دانہ دیکھ کر جب قریب آیا تو انہوں نے اسے پکڑ لیا اور اس کی مشکیں کس دیں۔ یہ ترکیب انہیں اس لئے کرنی پڑی کہ بہت دیر سے گھوڑا ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بعد جب وہ ان محدث کی طرف مخاطب ہوئے اور حدیث بیان

کرنی چاہی تو ان محدث صاحب نے کہہ دیا کہ مجھے تمہاری حدیث منظور نہیں ہے۔ کیونکہ جو شخص گھوڑے کے ساتھ چالبازی اور دھوکا کر سکتا ہے ممکن ہے کہ وہ انسانوں کے ساتھ بھی دھوکا کرے۔ اس غیر معمولی احتیاط کا نتیجہ ظاہر تھا کہ ان کا یہ تکلیف دہ اور طویل سفر بے کار گیا۔

مگر یہ سب غیر معمولی اہتمام صرف اس لئے تھا کہ احادیث زیادہ سے زیادہ صحیح جمع ہو سکیں اور ان میں غلطی کا امکان کم سے کم رہ جائے۔ محدثین کی ان کوششوں کی پشت پر وہ خدائی مشیت اور مرضی بھی موجود تھی جو قرآن میں یہ حکم دیتی ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اللہ نے ہماری ہدایت اور آیت کے پہلے جزو پر عمل کرانے کی خاطر قرآن کو اس کے حفاظ کے توسط سے محفوظ کر دیا ہے اور آیت کے دوسرے جزو یعنی رسولؐ کی اطاعت کیلئے احادیث کو محدثین کے ذریعہ محفوظ و قائم کر دیا ہے۔ اور اب ہم اطیعوا اللہ اور اطیعوا الرسول پر بغیر کسی دقت کے عامل ہو سکتے ہیں۔ اگر قرآن کے ساتھ اللہ تعالےٰ رسولؐ کا نور نہ بھیجتا تو اس نور کی روشنی کے بغیر قرآن کے معنی دیکھنا ممکن نہ رہتا۔ خداوند کریم نے اپنے رسولؐ کو دو چیزیں دی ہیں اور دونوں کا ذکر بالکل الگ الگ ہے۔ ان میں سے پہلی تو "الکتاب" ہے اور دوسری کا نام "الحکمت" ہے۔

جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد سنتِ رسولؐ کی ہمیں ضرورت نہیں۔ وہ ہمیں بتائیں کہ قرآن نے صرف اقیموا الصلوٰۃ کا ذکر کیا ہے، آپ بتائیے کہ صلوٰۃ سے مراد کیا ہے۔ اگر کسی نہ کسی طرح اس کا مطلب ہم نماز سمجھ لیں تو یہ کس طرح پڑھی جائے۔ کب پڑھی جائے اور کتنی پڑھی جائے؟ اس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ملتا۔ اگر احادیث ناقابل اعتبار ہیں تو نماز کی کیا صورت ہوگی۔ قرآن میں فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء کی نمازوں میں کتنی رکعت پڑھنی چاہئیں۔ اس میں فرض کی تعداد کیا ہے اور سنت کی کیا۔ نیز یہ کہ نماز میں آخر کون سی چیز پڑھی جائے۔ اس کی سب تفصیل تو حدیث اور صرف حدیث ہی میں ملتی ہے۔ یہی حال "اٰتوا الزکوٰۃ" کا ہے۔ زکوٰۃ کب دینی چاہئے۔ آیا ہر روز، ہر سال، یا صرف زندگی میں ایک دفعہ کافی ہے۔ اس پر قرآن روشنی نہیں ڈالتا۔

اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کس حساب سے وصول کی جائے گی اور کن کن چیزوں پر وصول کی جائے۔ روزوں کے سلسلہ میں بھی صرف "اَیَّامً مَعْدُوْدَات" کا اشارہ ہے۔ جس کے معنی چند روزے کے ہیں۔ اس کی تعداد اور دوسری تفصیلات معلوم کرنے کا واحد ذریعہ حدیث ہی ہے۔ قرآن پاک میں احکام کی تفصیل نہ ہونے کا یہ معنی نہیں ہیں کہ قرآن اپنی تفصیل کے لئے کسی دوسری چیز کا محتاج ہے۔ قرآن محتاج نہیں ہے بلکہ ہم محتاج ہیں اور اللہ تعالےٰ نے ہمارے اس احتیاج کو پورا کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور حضورؐ کی اطاعت کو منصوص قرار دیا۔ اللہ تعالےٰ نے تنہا "الکتاب" نہیں بھیجی بلکہ اس کے ساتھ ایک لانے والے کو بھی بھیجا اور اس سے تین فرائض متعلق فرمائے :-

(۱) آیاتِ قرآنی کی قرأت

(۲) کتاب وحکمت کی تعلیم اور

(۳) اہلِ ایمان کا تزکیہ نفس۔

تو احادیث دراصل قرآن ہی کے حکم اور منشاء کو پورا کرنے والی ہیں اور قرآن پر اضافہ نہیں ہیں بلکہ اس کی قولی وعملی تفسیر وتفصیل ہیں۔ اگر حضورؐ کی "رسالت" "ربوبیتِ الٰہی" پر اضافہ نہیں ہے تو آپؐ کی "سنّت" قرآن پر اضافہ نہیں کہی جا سکتی بلکہ وہ اس کی عملی تفسیر ہے!

بالکل یہی حال اور معاملات کا ہے۔ عبادات، طہارت، معاشرت، اخلاق، سیاست ومعیشت کے بیشتر احکام قرآن مجید میں سرے سے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا ذکر احادیث نبویؐ میں ہے، اس لئے حدیث کے بغیر اسلام اور قرآن پر عمل ناممکن ہے۔ منکرینِ حدیث یہ کہتے ہیں کہ ان مسائل میں امت کا عمل تواتر ہم تسلیم کریں گے یعنی عام مسلمان عبادات کے سلسلہ میں جو اعمال مسلسل اور متواتر انجام دیتے چلے آرہے ہیں اسے دیکھ کر ہم اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ مگر اُمتِ مسلمہ میں اور بھی بہت سے اعمال مسلسل اور متواتر چلے آرہے ہیں اور ان میں سے بعض غیر شرعی بلکہ مشرکانہ ہیں۔ کیا تواتر کی وجہ سے انہیں تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے قاری اور عامل کو قدم قدم پر حدیث کی ضرورت

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معتزلہ کے گروہ میں سے بعض افراد نے انکارِ حدیث کی بجائے ایک اور مسلک ایجاد کیا۔ یعنی یہ کہ ہم صرف ان حدیثوں کو مانیں گے جو "تواتر" سے ثابت ہوں۔ حضرت امام شافعیؒ نے حدیث کا مطلق انکار کرنے والوں کے ساتھ اس تواتر والے گروہ کی بھی اپنے رسالہ میں خوب خبر لی ہے اور بتایا ہے کہ صحیح حدیث ہر صورت میں قبول کرنی ہوگی۔

حدیث کے بارے میں پرویز صاحب کا رویہ عجیب و غریب ہے۔ کبھی تو وہ احادیث کو "عجمی سازش" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور کبھی منکرِ حدیث ہونے کے الزام کی تردید فرماتے ہیں۔ مگر "طلوعِ اسلام" کے ہر شمارہ میں حدیث کی کتابوں سے چُن چُن کر چند مخصوص حدیثیں جمع کی جاتی ہیں۔ جو اس نوعیت کی ہیں کہ ان کو پڑھ کر ناواقف آدمی یہ خیال کرنے لگے کہ احادیث نعوذ باللہ لغویت کا طومار ہیں۔ حالانکہ اس طرح سے اگر کوئی شخص چاہے تو ایک خاص ذہنیت کے مطابق چھانٹ کر قرآن مجید کی آیتوں کو بھی ایسا ترتیب دے سکتا ہے کہ وہ مضحکہ خیز معلوم ہوں۔ لیکن اس طرح کے سفلہ پن سے قرآن کی عظمت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا۔ اور حدیثوں کو بھی یوں مخصوص طریقے پر معاندانہ طرز سے ترتیب دے کر کوئی شخص رسولؐ کے اقوال و اعمال کو بے وزن ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر پرویز صاحب منکرِ حدیث نہیں ہیں تو پھر یہ سلسلہ کس لئے جاری ہے؟ جہاں تک علماء کا تعلق ہے وہ یہ مانتے ہیں کہ روایت کے اعتبار سے غلط اور موضوع احادیث بھی موجود ہیں مگر حدیث کے اصولِ درایت و روایت کی مدد سے حدیث کا عالم اسے فوراً پہچان جاتا ہے۔ مثلاً ابنِ جوزی نے محدثین کے اصولِ درایت بیان کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے:

"جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصولِ مسلّمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے اس کی نسبت یہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس حدیث کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر۔ اسی طرح سے وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہے، یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے یا جو محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو قطعاً قابلِ اعتبار نہیں ہیں"

(فتح المغیث)

ملا علی قاری نے موضوعات کے خاتمہ میں یہ لکھا ہے :

"جس حدیث میں فضول باتیں ہوں، جو مشاہدہ کے خلاف ہو، جو صریح حدیث کے خلاف ہو اور وہ حدیث جو قرآن کے خلاف ہو، یا وہ جس میں رکیک الفاظ یا مضمون پایا جائے ناقابل اعتبار ہیں۔

روایت اور درایت کے ان تمام اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھنے کے بعد جو احادیث صحیح ثابت ہوں اور ان سے جو سنت مستنبط ہوتی ہو اسے تسلیم کرنے سے انکار کرنا انکار حدیث ہے۔ اگر اس سنت کو پرویز صاحب دین ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہیں تو وہ بلاشبہ منکر حدیث ہیں۔ اس بارے میں نہ انہیں خود مبتلائے غلط فہمی رہنا چاہیئے اور نہ دوسروں ہی کو دھوکا دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ وہ انکار حدیث کا مسلک شوق سے اختیار کریں لیکن یہ جان لیں کہ اب سے پہلے معتزلہ نے حدیث کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے لاکھ جتن کر ڈالے اور باوجود یہ وہ پرویز صاحب اور ان کی طرح کے لوگوں کے مقابلہ میں سینکڑوں گنا زیادہ علم رکھتے تھے، مگر انہیں اپنے مقصد میں تندہی ناکامی ہوئی۔ حدیث کے سلسلہ میں معتزلیوں کا یہ طرز فکر علمائے حق کے دلائل و استدلال کی تاب کسی وقت بھی نہیں لا سکا۔ اور آخر کار اس نے اپنے آپ کو ایک اور دوسری تحریک کی صورت دی۔ یہ تحریک اسلامی تاریخ میں فرقہ باطنیہ کے نام سے مشہور ہے۔

باطنیوں کے مسلک کی بنیاد معتزلہ کی فلسفہ پرستی، سائنس پرستی اور عقل پرستی پر استوار کی گئی۔ اور چونکہ اس کے ایرانی علمبردار پکے وطن پرست بھی تھے، اس لئے انہوں نے عرب کے غلبہ و تفوق کے خلاف اپنی وطنیت کو سربلند کرنے کے لئے عجیب و غریب عقائد تراش کر ایک فرقہ کی داغ بیل ڈالی دی۔

باطنیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر زمانے کے لئے ایک شریعت کا اصول اور ہر زمانہ یا ہر دور کے لئے مذہب کا ایک بندھا ٹکا نظام نہیں چل سکتا۔ اس لئے ایک دین کے باوجود بہت سی شریعتیں آتی رہی ہیں اور آئندہ بھی " صد جہاں باقی است در قرآں ہنوز " کے " طابق الگ الگ زمانے کے لئے جدا جدا شریعتیں بنائی جائیں گی۔ کیونکہ اصل میں شریعت

تو صرف مذہب کا لباس ہے۔ جو انسان کی ذہنی ترقی اور زمانہ کے ماحول اور موسمی حالات کی بنا پر ہمیشہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا ؎

دم بدم گر خود لباس بدل مرد صاحب لباس را چہ خلل

کے نظریہ کے مطابق باطنیہ صرف اصل دین حقائق اور مذہب کے بنیادی اصولوں ہی کو دائمی و ابدی شے سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب کا اوپری ڈھانچہ، رنگ روپ، رسم و رواج کبھی اس حیثیت سے ہمارے پیش نظر نہیں رہنے چاہئیں کہ یہ اصل دین کی طرح ان مٹ ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ قرآن جس سوسائٹی میں نازل ہوا وہاں اس نے اپنے زمانے کے شعور، ذہن کی سطح، تاریخی روایات، معاشی حالات اور تہذیبی پس منظر کے مطابق ایک خاص شکل اور ایک خاص شریعت اختیار کی۔ اس شکل کو دائمی اور ابدی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت، منہاج اور مناسک کے قوانین اولی الامر کی مرضی پر منحصر ہیں۔ وہ جس قانون کو چاہے مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر منسوخ کر دے اور جسے چاہے باقی رکھے۔ باطنیہ کہتے ہیں کہ احادیث کے بیشتر قوانین اور اصول رسول اللہ نے بحیثیت اولی الامر یا صدر ریاست کے وضع کیے تھے اور وہ وحی نہیں ہیں۔ ان قوانین احادیث کی اہمیت وقتی، مقامی اور عارضی تھی۔ کیونکہ بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے اُن کی پابندی کو کہیں بھی ناگزیر نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ مسلمانوں کے لیے اس باب میں رسولؐ کی سنت کی بجائے اولی الامر کی مرضی اور اس کی بصیرت کے مطابق کیے ہوئے فیصلے سند اور حکم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شریعت اسلام کے سلسلہ میں پرویز صاحب کا مسلک بھی یہی ہے کیونکہ وہ بھی احادیث نبوی کو اس بنا پر کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ حضورؐ نے یہ فیصلے بحیثیت رسولؐ کے نہیں کئے تھے اور یہ اقوال و اعمال حضورؐ کی پیغمبرانہ حیثیت میں جاری نہ ہوئے تھے، بلکہ یہ صدر ریاست اور اولی الامر کے احکامات و اعمال ہیں اور رسول یا پیغمبر کی اطاعت کے ضمن میں اس کی حیثیت اولی الامر کا اتباع ضروری نہیں ہے۔ لیکن عام مسلمان باطنیوں اور پرویز صاحب کے خلاف یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضورؐ اکرمؐ نے جس دین کی تبلیغ فرمائی اُس کی شریعت کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔

دراصل زمانہ چاہے کتنی ہی کروٹیں کیوں نہ بدلے، اس کے مزاج اور طبیعت میں کوئی دنیاوی فرق پیدا نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر زمانہ جُدا جُدا ایک اکائی اور الگ الگ وجود نہیں ہے بلکہ یہ ایک وحدت ہے جسے کہیں بھی تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اور زمانہ کی اسی یکسانیت کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت بھی غیر متغیر ہے، یہ فطرت ابتدائے آدمیت سے ایک ہی رہی ہے اور آخر تک ایک ہی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی رسوم یا قوانین جو شاید حضرت آدمؑ کے زمانے اور انسانیت کے ابتدائی دور میں وضع کئے گئے تھے۔ اب تک قائم ہیں۔ آپ کسی قوم یا علاقے کی رسومات، روایات، عادات، اطوار، طور طریق کو دیکھ لیجئے تو یہ معلوم ہوگا کہ ان کی بیشتر رسومات اور بہت سے طور طریقے نہ صرف پرانے بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں برس سے جاری وساری ہیں۔

پھر جب صورت یہ ہے کہ انسانوں کی متعین کردہ معمولی رسومات سینکڑوں اور ہزاروں برس سے قائم و دائم ہیں تو آخر محمد رسول اللہ کی شریعت کو کیا ہوگیا کہ وہ ہزار برس ہی میں منسوخ ہو کر رہ جائے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے بیشتر قوانین ابتدا ہی سے عالمگیر حیثیت رکھتے تھے اور اسی لئے وہ جزوِ شریعت ہیں۔

پرویز صاحب میں اور باطنیوں کے اصول اساسی میں یہ نظریہ بھی مشترک ہے کہ تمام معاملات میں "اولی الامر" کی رائے گناہ اور عیب سے پاک سمجھی جائے، اور اس کے سب احکام لوگ بلا چون وچرا مان لیں۔

"طلوعِ اسلام" کے صفحات میں وقتاً فوقتاً بعض ایسے مضامین بھی نکلتے رہتے ہیں کہ اس میں اولی الامر کے اختیارات کے بارے میں اسی تصور کی نمائندگی ملتی ہے جو زمانہ قدیم کے باطنیوں یا زمانہ حال کے فاشسٹوں کے درمیان موجود تھا۔ ملّتِ اسلامیہ میں اختلافِ فکر ونظر کے وجود کو پرویز صاحب بھی صحیح نہیں سمجھتے ہیں کہ ساری امّت کو متحد کرنے کے لئے ہر طرح کی مذہبی وسیاسی جماعتوں کو غیر قانونی قرار دے کر صدرِ ریاست کو غیر محدود اختیارات دینے چاہئیں۔ باطنیہ بھی اپنے حدود میں کسی اور گروہ کو سیاسی یا مذہبی طور پر

منظم دیکھنا نہیں چاہتے اور ان کا امیر بھی بالکل ہٹلر کے انداز میں مطلق العنان اور خدائی اختیارات کا حامل ہے۔

باطنیوں نے اولی الامر کے انہی اختیارات کے جواز کے لیے امامت من جانب اللہ، حلول، وغیرہ کے عقائد وضع کئے ہیں۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ امامت چونکہ منجانب خدا ہوتی ہے اور امام کو خدا تعالیٰ خاص طور پر منتخب کرتا ہے۔ اس لئے وہ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں مطلق فضیلت کا مالک ہے اور اس فضیلت کا نتیجہ معصوم عن الخطا ہونا ہے۔ دوسرے معنوں میں جماعت کا اولی الامر گویا ظلِ الٰہی ہے۔ کیونکہ اس کی مرضی میں ہمیں خدا کی مرضی نظر آتی ہے۔

اپنے اس نقطۂ نظر کی تقویت کے لئے وہ حلول یا اوتار کے عقیدہ کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صفاتِ خداوندی صدر ریاست کی شخصیت میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص یہ رائے رکھتا ہو وہ تو اولی الامر کی مطلق اطاعت کا قائل ہی ہوگا۔ کیونکہ اس کے پاس اپنی رائے کی تائید میں صحیح یا غلط کچھ دلائل اور ایک خاص فلسفیانہ پس منظر موجود ہے۔ مگر پرویز صاحب جب امیر کی اطاعتِ مطلقہ کو ضروری بتاتے ہیں تو اپنے مسلک کی تائید میں صحیح یا غلط کسی قسم کی بھی وہ بنیاد نہیں بتاتے کہ ہم کیوں اس نظریہ کو معقول سمجھیں۔ آخر وہ دلیل کون سی ہے جس کی رُو سے اولی الامر یا صدر ریاست کو آپ اتنے غیر محدود اختیارات کا مالک قرار دیتے ہیں کہ اگر وہ چاہے تو شریعتِ محمدیہ کو منسوخ کر دے یا اگر وہ مناسب سمجھے تو اکثریت کے مقابلہ میں صرف اپنی ذاتی رائے کو دوٹوک فیصلہ کی حیثیت دے دے اور جس کی یہ شان ہو کہ اس کے مقابلہ میں کوئی اختلاف کرنے والا گروہ باقی نہ رہ سکے۔

اگر اولی الامر خدا کا خاص منتخب فرد نہیں ہے اور ہماری طرح ہی طرح کا انسان ہے تو پھر بتایئے کہ اُسے اپنی ذاتی رائے اکثریت پر مسلط کرنے کا کیا حق ہے۔ پھر جمہور کی مرضی یا اکثریت کے فیصلے سے چُنے جانے والا اولی الامر انتہائی محدود، کم سے کم اور صرف ناگزیر اختیارات اپنے لئے طلب کر کے حکومت کرتا ہے۔ کیونکہ از روئے کتاب و سنّت انسان

کی حاکمانہ مطلق العنانی ہی دنیا کی تمام خرابیوں اور فساد کی جڑ ہے۔ اس لئے اسلام چاہتا ہے کہ غالب جماعت یا فرد کے ہاتھوں میں سیاسی حاکمیت مذہبی اقتدار اور معاشی تسلط انتہائی کم سے کم ہو۔ اسلام کسی ایسے نظام حکومت کی حمایت نہیں کرتا جہاں عوام کی انفرادی آزادی سلب ہو سکے اور جہاں پر ریاست یا صدر حکومت "الٰہ" بن جائے۔ ہیگل، مارکس اور باطنیوں کے کلیت پسندانہ نظام ہائے حکومت اسلامی نقطہ نظر سے بالکل غلط ہیں۔ اس لئے اسلامی حکومت کے صدر غیر محدود اور انتہائی اختیارات کے مالک کبھی نہیں رہے

پرویز صاحب اور باطنیہ پہلے تو رسول اللہ کو منصب رسالت سے ہٹا کر مقام اولی الامر تک لے آنے کی جسارت بے جا کرتے ہیں اور پھر اولی الامر کو منصب رسالت پیر د کرتے ہیں تاکہ وہ غیر محدود اختیارات کا مالک اور ایک نیا شریعت ساز بن سکے۔ یہ فکر بالاتفاق مردود ہے اور اسلامی حکومت میں اولی الامر کے اختیارات مطلق اور آزاد نہیں ہیں۔ بلاشبہ نص قرآنی یا سنت رسول کے خلاف اکثریت یا شوریٰ اگر کوئی فیصلہ کر رہی ہو تو امیر کو اسے مسترد کرنے کا حق حاصل ہے۔ جیسا کہ ابوبکرؓ صدیق نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں تنہا اپنی رائے کو درست سمجھا اور اسے نافذ کیا مگر اکثریت کی رائے کتاب اللہ اور سنت رسول کے خلاف نہ ہو اور اختلاف سارا اولی الامر کی ذاتی رائے سے ہو تو شوریٰ اور اکثریت کے فیصلہ کا "اولوالامر" کو لحاظ کرنا ہوگا۔

بعض انتظامی معاملات میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی اکثریت کے فیصلہ کو درست قرار دیا ہے، جب ذات رسالت مآب کا شوریٰ کے معاملہ میں یہ حال ہو تو دنیا میں کسی دوسرے کو چاہے وہ اولی الامر ہو یا صدر مملکت یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ وہ ان باتوں کو یک قلم نافذ و جاری کر دے جو مجلس شوریٰ کے نزدیک قطعاً غلط ہوں!

باطنیہ و معتزلہ کے افکار کی یہ جھلک پرویز صاحب کے خیالات میں اس لئے نظر آتی ہے کہ وہ جن لوگوں سے متاثر ہیں۔ انہوں نے اپنی ذہنی رجحان اور تفکر کو ترقی دینے میں مندرجہ بالا فرقوں کے نظریات سے بڑی مدد لی تھی۔ مثلاً سرسید کو دیکھئے وہ مغربی طرز فکر

سے اثر پذیر ہو کر ایک نئے مکتب خیال کی بنیاد رکھتے ہیں۔ سر سید نے اگر معتزلہ کے خیالات کا مطالعہ نہ کیا ہوتا تو یقیناً اُن کی وہ مشہور تفسیر منظر عام پر نہیں آسکتی تھی جس نے مذہبی طبقہ کو برافروختہ کر دیا تھا۔ سر سید کی اس تفسیر قرآن میں فرشتوں کا انکار، عذاب قبر کا انکار، حشر و نشر اور معاد و آخرت کی نئی تشریح، روایات و احادیث کے خلاف عدم اعتماد، علماء، فقہاء اور محدثین پر تہمت تراشی، غرض وہ سب کچھ ہے جسے ہم معتزلہ کے افکار کا نچوڑ کہہ سکتے ہیں۔

اسے از سر نو پیش کرنے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی تھی کہ انہوں نے عیسائی پادریوں کی وہ بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں جن میں اسلام، قرآن اور سنت رسولؐ کو خلاف عقل اور خلاف سائنس بتایا گیا تھا۔ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے ساتھ ہی یورپ سے پادریوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا اور یہ پادری سڑکوں، چوراہوں اور راستوں پر مجمع لگا کر ہندوستان کے مذہب کو نیچر، عقل اور سائنس کے خلاف ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

عیسائی پادریوں کی یہ تبلیغی جد و جہد ہندوستانیوں پر اثر انداز ہوئی اور سب سے پہلے ہندوؤں نے اپنے مذہب کو ترمیم و تنسیخ کے ذریعے نیچر، عقل اور سائنس کے ذریعے ثابت کرنے کے لئے مختلف تحریکات کا آغاز کیا اور ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی کچھ لوگوں کو یہ شوق چرایا۔ ان لوگوں میں مرزا غلام احمد قادیانی اور سر سید دو بڑی مشہور ہستیاں ہیں ــــ!

مرزا غلام احمد قادیانی کے پادریوں کے ساتھ بڑے مناظرے رہے مگر ان مناظروں کی بدولت ان کا ذہن پادریوں سے شکست کھا گیا اور انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ مسیح، مہدی، دجّال وغیرہ کے متعلق جو احادیث پائی جاتی ہیں انہیں عقل اور نیچر کے مطابق کیا جائے اور نبوت، وحی وغیرہ کے مسائل پر بھی سائنسی نقطۂ نظر سے نظر ثانی ہو۔ لیکن اس طرح پر تجدید اسلام کی کوشش بالآخر ایک نئی نبوت کے قیام کا ذریعہ بن گئی اور اسلام کو نیچر کے مطابق بنانے کی یہ مہم ملت اسلامیہ سے بالکل الگ ایک جداگانہ فرقہ کی صورت اختیار کر کے ختم ہو گئی۔ سر سید نے مرزا غلام احمد قادیانی کے مقابلہ میں زیادہ عقلمندی سے کام لیا۔ انہوں نے اس کی کوشش نہیں کی کہ وہ کسی مستقل فرقہ کے بانی بن جائیں۔ اُن کے اندر یہ داعیہ موجود نہ تھا۔ ہاں اس

کو نیچر، سائنس اور عقل سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بلکہ مہم ان کے پیش نظر رہی اور اللہ تعالیٰ سے اُن کی لغزشوں کو معاف فرمائے۔ اس منزل میں انہوں نے بڑی بڑی ٹھوکریں کھائیں! مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ انہیں واقعی خلوص بھی تھا۔ اور عیسائی پادریوں کے اعتراضات کے جواب میں اُن کے جذبۂ ایمانی کو موافقت کی یہی ترکیب کارگر نظر آئی کہ جن مسائل کی وجہ سے یہ اعتراضات ہو رہے تھے ان مسائل کے بارے میں معتزلہ کی رائے نقل کر کے مشتہر کر دی جائے اور ان کی یہ کوشش جدید نوجوانوں کے گروہ پر کافی اثر انداز ہوئی۔

سر سیّد بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ان کے بھی حامی ہو گئے تھے کہ مسلمان اپنے کلچر اور تمدن کو ترک کر کے یورپین تہذیب کو اختیار کر لیں۔ تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں کہ ترکوں نے اپنی قدیم معاشرت و وضع قطع ترک دی ہے۔ اب وہ میز کرسیوں پر بیٹھ کر چھری چمچے سے کھانا کھاتے ہیں۔ داڑھی منڈواتے ہیں اور کوٹ پتلون پہننے لگے ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کو بھی ترکوں کی تقلید میں ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ اپنے اس خیال کی وجہ سے انہیں علماء سے بڑی جنگ کرنی پڑی۔ مولویوں کا کہنا تھا کہ ہر قدم میں کچھ رسومات اور روایات ایک خاص تسلسل کے ساتھ جاری و ساری ہوتی ہیں۔ یہ تسلسل توڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم قوم کو تباہ کر دیں۔ ہر قوم کے لئے اس کا ماضی مستقبل و حال کی تعمیر کے لئے ایک بنیاد ہے اور ماضی سے اپنا تعلق ختم کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم معلق ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر بہت ساری رسومات، روایات اور طور طریق ملّی زندگی کے لئے ایک امتیازی نشان اور "Symbol" ہوتے ہیں۔ ان روایات، رسومات اور طور طریق میں ہمارے بنیادی افکار پنہاں ہیں۔ انہیں مٹانے کے معنی خود اپنے آپ کو مٹانے کے ہیں۔ مولویوں کی یہ بات سر سیّد کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ محض ہمارے قدامت پسند طبقہ اور مولویوں کی جہالت ہے مگر حقیقتاً ان لوگوں کے علاوہ اکبر الٰہ آبادی، ڈاکٹر نذیر احمد اور دوسرے انگریزی تعلیم یافتہ افراد بھی سر سیّد کے مخالف تھے۔ کیونکہ کسی بھی قوم کا ذہین اور خوددار طبقہ اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کو یوں آسانی سے خودکشی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس لئے سر سیّد کی تحریک بحیثیت مجموعی ناکام ہو گئی۔ مگر چونکہ برطانوی راج کی مصلحتیں اس تحریک کے ساتھ

وابستہ تھیں اس لئے آزادیٔ ہند تک یہ مسلک کسی نہ کسی طرح زندہ رہا۔ اور اب سمٹ سمٹا کر ہماری سوسائٹی کے ایک خاص طبقے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ مگر عوام پرانی تہذیب پرانے کلچر کو ختم کرنا نہیں بلکہ اُسے ترقی دینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدیم شریعت کی تجدید کے مطالبے سُنتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ مطالبے اُن لوگوں پر گراں ہی گزریں گے جو آج بھی سرسیّد کے طرزِ فکر کو اپنائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ " طلوعِ اسلام " مسلمانوں کی اس کوشش کو پسند نہیں کرتا ہے جو وہ اسلامی دستور کے سلسلہ میں کر رہے ہیں۔

مگر ہم کو یہ حقیقت بہرحال اب سمجھ لینی چاہیئے کہ ایک مسلمان ہی کیا دنیا کی کسی قوم کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی قدیم شریعت اور قدیم فقہ کا گلا گھونٹ کر آگے بڑھ سکے۔ بدقسمتی سے ہمارے نوجوانوں کی ایک جماعت ترقی کا مطلب یہ سمجھنے لگی ہے کہ ایک قوم اپنے سینکڑوں برس کی تاریخ و تہذیب کو یک قلم منسوخ قرار دے اور مذہبی، معاشرتی، تاریخی و جغرافیائی زندگی سے جو رشتہ ہمارا قدیم نظامِ زندگی رکھتا ہے، اسے سمجھے بغیر پرانے نظام کے چہرے پر خطِ نسخ پھیر دیا جائے۔ یہ ذہنیت جس کی ابتدا سرسیّد نے کی تھی عمرانیات کی تاریخ سے ناواقفیت کا سبب اور عقلی جدت طرازیوں کا پیدا کردہ کھلونا ہے۔ اور اس سے ہمارا مغربی تعلیم یافتہ طبقہ بہت زمانے سے دل بہلا رہا ہے۔

کسی بھی شے کو ترقی دینے کے معنی اس کے وجود کو قائم رکھ کر مزید نکھار پیدا کرنے کے ہیں، نہ یہ کہ سرے سے اس کا وجود ہی ملیامیٹ کر دیا جائے۔ ـــــــ

پس کسی تہذیب کی ترقی کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اس تہذیب کی خصوصیات باقی رہیں اور اس کے حُسن میں کچھ اضافہ ہو جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم اپنی تہذیب پر تبرا بھیجنے لگیں اور اس کے حریف بن جائیں۔ ہر قوم کی ایک مخصوص طبیعت اور فطرت ہے جو تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی مظاہر میں گھل مل کر رفتہ رفتہ پرورش پاتی رہتی ہے اور برسہا برس کے تاریخی، جغرافیائی و نفسیاتی عوامل کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے جو کسی ایک معاشرے کی تخلیق کر کے اس کو اکثر پہلوؤں اور اکثر اعتبارات سے ایک قطعی شکل دیتا ہے، اس

معاشرے اور تہذیب کا خاتمہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی قومی فطرت و جبلت کو قتل کر دیں اور صدہا برس کے عوامل کو نظر انداز و فراموش کر کے تہذیبی اعتبار سے دیوالیہ اور برباد ہو جائیں۔ اگر یہ حقیقت سرسید سمجھ لیتے تو پھر نہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے جواز کا فتویٰ دیتے اور نہ ہندوستانی مسلمانوں کو چھری چمچوں کانٹوں اور میز کرسیوں کے استعمال کا فلسفہ سکھاتے اس کے مقابلے میں ہمارے پاس کے مولوی کی آپ چاہے کتنی ہی برائی کیوں نہ کریں۔ مگر اس کی یہ حقیقت پسندی تو واقعی قابلِ داد ہے کہ اس نے ترقی کی محض خالی اڑان اور چھلانگ کی خاطر یہ بات کبھی نہیں بھولی کہ قومی تہذیب اور قومی تمدن کے ساتھ اس کا رشتہ ایسا نہیں ہے کہ جب وہ چاہے اسے طلاق دے دے۔ اپنی اسی خوبی کی بدولت "مولوی" مغرب زدہ طبقہ میں ملامت کا مستحق سمجھا گیا تھا۔

سرسید کے بعد مولوی کو گالیاں دینے کی تحریک ایک عرصہ تک رُکی رہی اور اس کا دوسرا دور علامہ مشرقی کی صورت میں جاری ہوا۔ علامہ مشرقی اصل میں سرسید کا نیا روپ تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کی تحریک سرسید سے زیادہ منظم، اُن کے افکار سرسید سے زیادہ مدلل بھی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ صاحب کی معرکتہ الآرا کتاب "تذکرہ" کی داد نہ دینا بڑا ظلم ہے، تذکرہ کا ایک ایک لفظ مشرقی صاحب کی محنت اور مطالعہ کی وسعت کا ثبوت دیتا ہے، اس کتاب میں علماء دین کے طرزِ فکر کو انتہائی ہوشیاری اور تدبیر کے ساتھ رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"تذکرہ" کا خلاصہ مندرجہ ذیل نکات ہیں:

(۱) ہمارے لئے صرف قرآن کافی ہے اور قرآن کو سمجھنے میں اسلامی تاریخ، روایات، حدیث، فقہ اور لغت کی مدد ہرگز نہ لی جائے۔ کیونکہ قرآن اپنا شارح آپ ہے اور تاریخ، روایات، حدیث، فقہ و لغت کی تشکیل کرنے والے سب عجمی سازش کا شکار رہے ہیں، اس لئے ان کی مدد سے قرآن کو سمجھنا گمراہی ہوگی۔

(۲) مطالعۂ قرآن سے پہلے ہمیں اس کی اصطلاحوں کی تعریف (Definations) طے کر لینی چاہئے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی اصطلاحات قرآن میں جہاں جہاں

استعمال میں ہیں انہیں دیکھا جائے اور پھر اس کا ایک ایک مطلب تعین کر دیا جائے اور یہ مطلب یا معنی قطعی سمجھ لئے جائیں۔

(۳) قرآن اور موجودہ یورپی سائنس کے اصولوں میں اتفاق پیدا کیا جائے کہ قرآن و سائنس "من دیگرم تو دیگری" کو خیرباد کہہ کر "من تو شدم تو من شدی" ہو کر رہ جائیں۔

(۴) حضور اکرمؐ نے قرآن کو نافذ کرنے کے لئے چند مخصوص اوزار عمل وضع کئے تھے۔ ان اوزار عمل کو چھوڑ کر نئے طریقے اختیار کئے جائیں کیونکہ از روئے قانون صرف دین کے بنیادی عقائد دائمی و ابدی ہیں۔ نہ کہ ان کا اوپری لباس مطمح نظر ہے۔

(۵) پوری ملت کی تنظیم جدید اس اصول پر ہو کہ ان کا اولی الامر غیر محدود اختیارات کے ساتھ ملت پر حکمرانی کرے اور یہ حکمران ایک ایسی ریاست کو بروئے کار لائے گا جو معاشرہ اور افراد کی زندگیوں کے تمام شعبوں پر کلیتاً قابض و متصرف رہے گی۔

علامہ مشرقی کے یہ اصول ہائے پنجگانہ جب علماء مفکرین کے درمیان زیر بحث آئے تو لوگوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ تذکرہ بھی باوجود یکہ بظاہر زیادہ مدلل اور معقول نظر آتا ہے مگر اس میں بھی سرسید کی پرانی ذہنیت کارفرما ہے اور علامہ مشرقی کے اصولوں کو مان لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسلامی اساس ہی کو کھود کر پھینک دیں۔!

علماء کا استدلال یہ تھا کہ اگر مسلمان مؤرخین، راویوں، محدثین، فقہاء اور اہل لغت حضرات کو عجمی سازش کا نمائندہ سمجھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہماری قوم ابتدا ہی سے غداروں اور احمقوں پر مشتمل رہی ہے۔ کیونکہ جس قوم کے محدثین کرام، فقہائے عظام، مؤرخین اور اہل لغت حضرات سب کے سب سازشی ہوں یا سازشیوں کے آلہ کار ہوں، اس قوم کے قرآن کا بھی کیا بھروسہ؟ کہ وہ بھی کہیں "عجمی سازش" کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ دوسرے معنوں میں یہ طریق فکر دانستہ یا نادانستہ ملت اسلامیہ کی تاریخی اہمیت اور عظمت کا انکار کر کے اسے سازشیوں اور سازشی جماعت کا نام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے کوئی بھی عقلمند آدمی صحیح نہیں تسلیم کرے گا۔ بلاشبہ یہ تو ممکن ہے کہ ہم میں

انفرادی طور پر کچھ لوگ غدار پیدا ہوئے ہوں۔ یا غیر شعوری طور پر بعض بزرگ بیرونی طاقتوں کے مفاد کا آلۂ کار بن گئے ہوں۔ مگر یہ سمجھنا کہ پوری کی ایک قوم کی قوم مع اپنے تمام بزرگوں اور اہلِ علم کے کسی سازش کی علمبردار یا آلۂ کار رہی ہو کس قدر غلط ہے۔

علماء کو علامہ مشرقی کی اس حرکت پر بھی اعتراض تھا کہ انہوں نے قرآن کے بارے میں یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ اس میں ایک ہی لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔ دراصل یہ صرف قرآن ہی نہیں بلکہ ہر زبان اور خاص طور سے عربی کی ایک خصوصیت ہے کہ روزمرہ بولی اور لکھی جانے والی زبان میں ہر لفظ سیاق و سباق کے اعتبار سے مختلف معانی پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت کو بھول کر قرآنی الفاظ کے ہر جگہ ایک ہی معنی متعین کرنا غلط ہے۔ قرآن سائنس یا کسی مخصوص علم و فن کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں ایک لفظ یا قاعدہ ایسی اصطلاح ہو کہ فلسفہ کی طرح جس کی تعریف طے کر لی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وحی، جنّت وغیرہ کے الفاظ قرآن میں مختلف جگہ پر مختلف معانی میں آئے ہیں۔ کہیں یہ لفظ "جنّت" باغ کے لئے استعمال ہوا ہے اور کہیں مادّی یا معاشی خوشحالی کے معنوں میں بھی مگر جس جنّت کا ذکر قرآن آخرت کے ضمن میں کرتا ہے، وہاں یہ قیامت کے بعد کی بہشت ہی مراد ہے۔ اسی طرح نزولِ وحی شہد کی مکھی پر بھی قرآن سے ثابت ہے اور حضور اکرم پر بھی لیکن ان دونوں مقامات میں وحی کا لفظ بالکل الگ الگ معنی رکھتا ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص مومنین کی جنّت کو اس معنی میں لے جس معنی میں "فاخرجنھم من جنت وعیون و کنوز و مقام کریم" پھر نکال باہر کیا ہم نے ان کو جنّت اور چشموں سے اور خزانوں اور عمدہ مکانوں سے" تو یہ ایک فاش غلطی اور غلط ترجمانی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کو وہی شے سمجھتا ہے جو مکھی کو حاصل ہے تو یہ گمراہ ذہنیت ہوگی۔ کیونکہ الفاظ گو سب جگہ ایک ہی استعمال ہوئے ہیں مگر سیاق و سباق کے اعتبار سے معانی مختلف ہیں۔ اس نکتہ کو فراموش کر دینے کا نتیجہ تھا کہ علامہ مشرقی نے قرآنی الفاظ کی نئی لغت تیار کی۔ اس لغت میں جنّت کے معنی مادّی و معاشی خوشحالی، جہنّم کا مطلب مادّی و معاشی تباہی

تقویٰ کے معنی اتحاد و ہم آہنگی، صالح کے معنی طاقت ور اور کافر کا مطلب مغلوب و کمزور، آخرت کے معنی انسانی مستقبل کے ہیں۔ اس دوسرے الفاظ قرآنی کے عجیب و غریب معنی و مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ اور قرآن پر جس شخص کی نگاہ ہو وہ ان معانی و مطالب کو کبھی درست نہیں جان سکتا۔

پھر قرآن و سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں انہوں نے قرآنی آیات سے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء، نیوٹن کے نظریات اور دوسرے یورپی مفکرین اور سائنس دانوں کے تراشے ہوئے نتائج ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک نظریۂ ارتقار کا تعلق ہے اس سے بیشتر ابن مسکویہ اور فارابی نے بھی قریب قریب یہی نظریۂ ارتقار پیش کیا تھا۔

انسان کی حیاتیاتی ارتقار کے اس نظریہ کی قرآن سے تصدیق یا تکذیب ناممکن ہے کیونکہ حیاتیات قرآن کا موضوع بحث نہیں ہیں۔ پھر ڈارون کے معاملے کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کے نظریہ کے سائنسی نتائج کے ساتھ ذاتی قیاسات اور نظریات کی آمیزش بھی کر دی گئی ہے۔ اور پھر ارتقار کے بارے میں ڈارون کا مطالعہ بھی نامکمل اور یک رُخی رہا ہے۔ اسی لئے لامارک کے پیرو ڈارون سے مختلف خیال رکھتے ہیں اور برنارڈ شا نے تو ڈارون کو کافی بُرا بھلا کہا ہے۔ حتیٰ یہ کہ اسے سولی کے مستحق سمجھتا تھا۔

ابھی حال ہی میں برگساں کے بعد ڈارون ازم کی روشنی پھیکی پڑ گئی ہے۔ یہی حال نیوٹن کا ہے۔ آئین سٹائن کی تصوریت نے نیوٹن کے بہت سے خیالات کو غلط ثابت کیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن سے ان غلط خیالات، مشکوک نظریات اور مشتبہ تھیوریوں کی تصدیق کا کام لینا اس کا بدترین استعمال ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ سائنس کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ جہاں تک علم سائنس کے نفسی پہلو کا تعلق ہے اس میں آج تک کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہوئی ہے اور نہ ہوگی جو قرآن کے مخالف ہو۔ البتہ سائنس کا قیاسی نظریاتی پہلو جو ہر دور میں ادلتا بدلتا رہتا ہے اور جو کتاب و سنت کے خلاف جا سکتا ہے اس میں اور کتاب و سنت میں نہ مطابقت دی جا سکتی ہے اور نہ اس کوشش میں وقت ضائع کرنا